ذوالکفل بخاری

روشنی، پھول، صبا……

(سفر نامۂ حجاز کا ایک ورق)

تقدیر کی خوبی…… ماہ وسال کی گردش …… بخت…… یا‘ اتفاق؟ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اِسے کیا نام دے؟ وہ ایک مسافر‘ جو پاکستان سے چلا اور حجاز جا پہنچا۔ یہی کوئی سال بھر پہلے۔ پوچھنے والے‘ پوچھا کیے کہ…… کیسے چلے اور کیسے پہنچے‘ پر وہ کیا بتاتا کہ کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا ؟ وہ کیا بتاتا کہ کتنی راہیں قطع ہوئیں‘ کتنی باقی تھیں؟ وہ کیا بتاتا کہ سفر کا کونسا مرحلہ کیسا تھا، کونسی منزل کیسی تھی؟ کتنے موسم تھے جو گزر چکے تھے، کتنے موسم تھے جو گزر رہے تھے، کتنے رستے تھے جو سمٹ کر بھی پھیلتے جارہے تھے اور کتنے رستے تھے جو پھیل کر سمٹ رہے تھے‘ اور کیسا زادِ سفر تھا کہ ختم ہوا جاتا تھا اور بچ بھی رہتا تھا۔ یہ موسم……’’حیرت‘‘ کے موسم تھے۔ یہ رستے……’’بہجت‘‘ کے رستے تھے اور زادِ سفر میں صرف دو چیزیں تھیں……خجلت اور خاموشی۔

پھر ایک روز …… یہ خاموشی ،نہایت خاموشی سے ٹوٹ گئی۔ مسافر نے چاہا کہ مٹھی میں بند خوشبو‘ کسی اور کو بھی ’’دکھائے‘‘۔ اُس نے ہتھیلی کھولی تو وہاں لفظوں کی تتلیاں……مردہ پڑی تھیں۔

یہ ایک خط کا قدرے طویل اقتباس ہے۔ خط……ایک بہت مہربان، بہت عزیز اور بہت فاضل دوست کے نام تھا کہ جن کی خاطر کا خیال اور جن کے ’’ارشاد‘‘ کی تعمیل ضروری تھی (1)۔ آج‘ سال بھر بعد……خیال ہوا کہ ہنر کی، فضل وکمال کی اور حُسن و خوبی کی نمائش تو ہر کوئی کرتا ہے، کیوں نہ ہم اپنی بے ہنری اور بے مائیگی کا ’’راز‘‘ کھولیں۔ ہر راز کو ایک دن کھلنا تو ہے۔

ہمارے عہد میں……تاریخ وسیرت کے امام (2) نے کہا تھا……

میری نسبت بداوت سے ہے‘ نسبت آپ سے اس کی
حضارت ، شیطنت کیشِ کفوری ‘ یارسول اللہ!

لیکن اب یہاں ’’بداوت‘‘ ……یعنی جو ہم سمجھتے، سنتے یا پڑھتے رہے ہیں‘ یا ’’بدّو پنا‘‘ …… برائے نام رہ گیا ہے۔ تیل کے سیال، چمکدار، چکنے، چپچپے اور ’’چُپڑے‘‘ ہوئے دھارے میں بہت کچھ بہہ گیا ہے۔ بظاہر کھجوریں، اونٹ، قہوہ، صحرا، خیمے اور چھوٹی چھوٹی (……اور کہیں کہیں بڑی بڑی) کھیتیاں وہی ہیں۔ بدّوؤں میں……افلاس اور قلاشی بھی یکسر ختم نہیں ہوئی۔ لیکن اس سادگی میں بہت کچھ ’’پُرکاری‘‘ حلول کر چکی ہے۔ گفتگوؤں میں‘ معمولاً دو موضوع ضرور ہوتے ہیں۔ یعنی جب واقعی گپ شپ چلے۔ شادی اور کار۔ یہ دونوں چیزیں یوں بھی بہت عام ہیں۔ کار سستی ہے‘ اس لیے عام ہے۔ شادی مہنگی ہے‘ پھر بھی عام ہے۔ ایک دو تین چار……نیا ماڈل……نئی شادی۔ ایک چٹکلہ سنیے۔ مدینہ طیبہ میں ایک پاکستانی عالم دین ہیں۔ بتلا رہے تھے کہ ایک دفعہ کتابوں کی نمائش سے‘ بہت سی کتابیں خریدیں۔ واپسی پر ٹیکسی میں بیٹھا تو ڈرائیور سعودی تھا۔ حیرانی سے بولا …… یہ اتنی کتابیں کیا

کروگے؟ کہا...... پڑھوں گا۔ پوچھا...... پھر' تمہارے کس کام کی رہیں گی؟ (یعنی بعد میں)...... کہا...... بہ حفاظت رکھوں گا۔ مجھے ان کی ضرورت رہے گی۔ بولا......ارے پگلے' اگلے سال تو ''نئے ماڈل'' آ جائیں گے۔

وہ جو اثرات......نسلی، جغرافیائی اور تاریخی عوامل کے ہوا کرتے ہیں وہ یقیناً ہیں۔ یعنی...... بے لاگ' بے باک اور بے آمیز بات کرنا' (عجم میں تو لوچ، لمبائی اور لغویت کے ''حسین امتزاج'' سے بُنا ہوا لفظی دھاگہ' نفی اور اثبات کے سبھی مفاہیم کو دانوں کی طرح سبحۂ گفتار میں بیک وقت پروسکتا ہے)......غلامی و آقائی، ماتحتی وافسری یا ''برہمنی طبقاتیت'' کے مظاہر کا مفقود ہونا۔ بے جا جذباتیت، بے جا عقیدت اور بے جا مثالیت پسندی کا ناپید ہونا...... یہ سب چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں۔ محسوس ہوتی ہیں۔ صاف صاف اور واضح واضح۔ ''مذہبی کلچر'' (میرا خیال ہے کہ دین داری' تدیّن یا مذہبیّت سے کچھ کچھ الگ مفہوم......اس ترکیب سے پیدا ہوسکتا ہے) ہمارے ہاں کے وہابی کلچر سے خاصا مماثل ہے۔ لیکن اس کے کچھ اپنے رنگ بھی ہیں......حد درجہ دل کش۔ یہاں کوئی کسی انجان کو (''اجنبی''، نہیں۔ اجنبی یہاں پردیسی اور تارک وطن کو کہتے ہیں) اے' اؤ' سنیے' بھائی صاحب......وغیرہ کہہ کر نہیں پکارتا۔ صرف ایک لفظ سے پکارا جاتا ہے......''محمد''......(صلی اللہ علیہ وسلم)! ہاں ہاں......وہ جو ایک کالی کملی والا، سب سے سچا، سب سے سوہنا، دلبر دلبراں، سرورِ سروراں......یہیں کہیں انہی زمینوں' انہی فضاؤں میں پلا بڑھا، چلا پھرا، سویا جاگا' ہنسا رویا، بولا......اور' چپ بھی رہا......تو پورے چھے عشروں پہ پھیلی اس کی ایک ایک کروٹ، ایک ایک ادا، ایک ایک پل کی یہ کہانی انہی زمینوں، انہی فضاؤں انہی ذروں میں سمائی ہوئی ہے۔ خدا کی قسم' ایک ایک ذرے میں! وہ چھے عشرے' دنیا کو کیا کیا نہ دے گئے؟......تو پھر یہاں کیا کیا نہ ہونا چاہیے؟ آج ڈیڑھ ہزار سال بعد بھی (منہ سے کہہ دینا آسان ہے) وہ سب ''ذرّے'' ویسے کے ویسے ہیں۔ یہ ایسے ہی رہیں گے۔ چھے ہزار سال بعد بھی' نہیں...... چھے لاکھ، چھے کروڑ، چھے ارب سال بعد بھی...... جب تک ''اُس'' کو منظور ہے۔ وہ' جو ذرّے بناتا اور ان میں تابانیوں کے جہان سمو دیتا ہے۔ یہ تابانیاں......' یہ کہانیاں......کون دیکھ سکتا ہے۔ کون سُن سکتا ہے؟ اگر کوئی ہے تو وہ آ کر دیکھے......کوئی سُن سکتا ہے تو سنے۔ کہاں، کس وادی، کس ساحل، کس صحرا، کس قریے، کس چوٹی، کس چشمے، کس ویرانے کی بات کی جائے؟ وہ چاپ محفوظ ہے۔ وہ گونج موجود ہے۔ یہاں کون چلا پھرا، یہاں کون سویا جاگا، کس کی حدیٰ تھی' کس کے رجز تھے، کس کی پکار تھی، کس کے قدم تھے......وہ کیا ہوئے؟ ایک ایک ذرّہ گواہی دیتا ہے۔ سچے سوہنے کی' سرور دلبر کی۔ اُسی کی نہیں' اُس کے گواہوں کی گواہی۔ گواہی دینے والوں کی گواہی۔ اب ان سے بہتر......نہیں نہیں' اُن جیسے لوگ بھی روئے ارض پر کبھی نہ ابھریں گے۔ پکی بات ہے۔ تاریخ کے مغالطوں کو، عقیدت کے مبالغوں کو اور عقیدوں کے ڈھکوسلوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ جھٹلایا جانا چاہیے۔ لیکن ان ذرّوں کی گواہی، ان فضاؤں کی گواہی...... ایسی محکم، ایسی قطعی، ایسی سچی گواہی کون جھٹلا سکا؟ کون جھٹلا سکے گا؟ سُنیے...... یہاں سانس لینا، یہاں قدم رکھنا، یہاں بولنا، ہنسنا اور رونا، چپکا بیٹھ رہنا، یا سونا، یا جاگنا......کچھ بھی سہل نہیں' واللہ! سہل نہیں۔ کن ذرّوں پہ قدم دھرتے ہو؟ کن فضاؤں کو آلودہ کرتے ہو؟ کتنے تبسم، کتنے گریے، کتنے بول، کتنے لشکر جیتی جاگتی، دل میں اترتی خاموشی کے، پاک پوتر خون پسینے کی مہکاریں، کتنی سانسیں، کتنی نیندیں، تہ در تہ ترتیب کے ساتھ! اب تک ویسی رکھی ہیں۔ پاک زمین پہ، پاک فضا میں۔

وہ جو سوہنے کی گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتے ہیں' سوچتا ہوں کیسے مزے میں ہیں۔ بس ایک دُھن، بس اک خیال میں

مگن۔ شانت اور سرشار۔ یہ ’’سرشاری‘‘ مجھے بھی چاہیے لیکن اس راہ پر چلوں تو‘ چلنا تو کجا‘ جینا بھی ممکن نہ رہے۔ بس اک خیال کی اسیری‘ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ عمل...... راہِ دشوار۔ خیال...... راہِ فرار! اور یہ جو سوہنے کی قوم ہے نا؟ صحرانشین، بادِیہ پیما...... یہ بھٹک سکتی ہے، بہک سکتی ہے، بھول سکتی ہے لیکن...... ’’بھاگ‘‘ نہیں سکتی۔ اس کا یہ کردار ہی نہیں۔ یہ بھاگنے والی ہوتی تو یہاں ذرّے ذرّے سے معجزے نمودار نہ ہوتے۔ میں ان ذرّوں کو دیکھتا ہوں، میں ان معجزوں کو سوچتا ہوں۔ آج بھی مجھے یقین ہے کہ ان بھٹکے ہوؤں کو، بہکے ہوؤں کو اور بھولے ہوؤں کو بس راستہ ملنے کی دیر ہے‘ معجزے پھر نمودار ہوں گے۔ راہِ دشوار کے اُس طرف۔ ’’یہ بجا کہ آج اندھیرا ہے...... ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے۔‘‘ ہاں جب دشوار راہیں پھر سے آباد ہوں گی۔ راہیں موجود ہیں۔ وہی کی وہی۔ وہیں کی وہیں۔ ویسی کی ویسی‘ اور...... ؎

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

ہمیں اس نقشِ پا کے سجدے کرنے ہیں۔ ہم کس نقشِ پا کے سجدے کر رہے ہیں؟ ؎

ہم اس کا نقشِ پا بھولے ہوئے ہیں
خداوندا یہ کیا بھولے ہوئے ہیں

اے کاش۔ اے کاش (خدا سعود عثمانی کی عمر دراز کرے‘ کیا لافانی شعر کہا کہ......) ؎

میں کاش سنگ ہی ہوتا کہ زندہ رہ جاتا
نقوشِ پائے پیمبر دوام کرتا ہوا

میں کیسے بتاؤں...... آہ‘ یہ کس سے کیا پوچھا جا رہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ نہیں‘ بہت دفعہ سنے سنائے اور پڑھے پڑھائے سبھی ’’آموختے‘‘ بے معنی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بے معنی نہیں...... بے اصل۔ جمے جمائے یقین، ایمان، اعتبار اور اعتقاد کے خیمے طنابوں سے اکھڑنے لگتے ہیں۔ کیوں؟ گمان کہتا ہے...... ارے کیا واقعی یہ اللہ کا گھر ہے؟ کیا ان وادیوں سے (وادِ غیر ذی ذرعٍ)‘ کیا ان سنگستانوں اور کہستانوں سے‘ ریگستانوں اور بیابانوں سے وہ ’’بگولے‘‘ اُٹھے تھے جو تہذیبوں کو‘ تمدّنوں کو، نظاموں کو، اقلیموں کو اور سلطنتوں کو ملیا میٹ کر گئے۔ سب کچھ بھسم، سب کچھ مسمار، سب کچھ منہدم! کیا واقعی؟ مگر کیسے؟ آخر کس طرح؟ کہیں کوئی مبالغہ تو نہیں؟ کوئی گھڑنت؟ کوئی گڑبڑ؟...... بہت سوچتا ہوں۔ دیر تک‘ بہت دیر تک۔ دور تک‘ بہت دور تک۔ لیکن ’’جواب‘‘ ایک ہی آتا ہے...... واللہ! سچ کہتا ہوں۔

تہذیب کے فریب کا انسان تھا شکار
ریگِ عرب نے کھولی حقیقت سراب کی

اس ریگ زار کو دیکھے بغیر سراب کی حقیقت نہیں کھلتی۔ معجزے سمجھ میں نہیں آتے۔ دیکھ کر ماننے کا‘ جاننے پہچاننے کا، سمجھنے اور بوجھنے کا اپنا ہی لطف ہے۔ ’’شنیدہ کے بود مانند دیدہ‘‘۔ مثلاً ایک عام سی بات ہے۔ بارہا...... بارہا نہیں بے شمار دفعہ کی‘ سنی ہوئی...... کہ صاحب‘ مکہ میں جلال ہے۔ مدینہ میں جمال ہے۔ وہاں ایسا ہے اور یہاں ایسا ہے۔ ایک عام سے شخص نے‘ ابھی یہاں آنے سے

پہلے یہی بات میرے سامنے دہرائی (وہ عمرے سے یا حج سے لوٹا تھا) تو میں نے دل میں کہا ’’سالا‘ بنتا ہے۔ اسے کیا پتا؟ سن سنا کر ‘باتیں رٹ لیتے ہیں لوگ۔ بے چارے۔ چلو اچھا ہے۔ جیسی بھی ایک ’’چھوٹی سی‘‘ دنیا...... عقیدے کی اور عقیدت کی ہے‘ اس میں خوش تو ہیں۔‘‘ واللہ العظیم...... میں نے یہی سوچا (میرا اللہ مجھے معاف فرمائے۔ **استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ**)۔ بد دماغی ملاحظہ فرمائی آپ نے؟ اب سنیے۔ میں مکہ پہنچا۔ حالت یہ تھی کہ ایک ڈرا سہما، گرا پڑا، میلا کچیلا، بد بودار، لتھڑا ہوا ’’کُتّا‘‘ (ہاں...... بالکل یہی) جیسے کسی گھر، کسی پناہ گاہ میں گھستا ہے تو دزدیدہ نظروں سے برابر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ ابھی دھتکارا جائے گا۔ ابھی......! چمکارے جانے کا تو سوال ہی نہیں۔ بس وہ جتنے بھی دن گزرے‘ اسی طرح گزرے۔ خانہ کعبہ کو دیکھتا تھا‘ دیکھتا رہتا تھا‘ دیکھتا رہتا تھا...... لیکن اندر کسی چیز کے ٹوٹنے یا پگھلنے یا کھنچنے کی کوئی کیفیت‘ کبھی نہ ہوئی۔ بس ایک ہی احساس۔ ’’تیرا یہاں کیا کام؟ ٹھیک ہے‘ ٹکریں وکریں مار لے تو بھی۔ تیرے جیسے کئی آئے اور کئی گئے۔‘‘ پھر ایک دن بارش ہوئی۔ موسلا دھار۔ کوئی دو گھنٹے تک۔ یہاں تک کہ گٹر اُبل پڑے۔ میں حرم کے باہر سڑک پر تھا۔ دل نے کہا ’’یہی بارش اُدھر مطاف میں اور میزابِ رحمت کے نیچے موجود لوگوں کا ’’حصہ‘‘ تھی، ’’قسمت‘‘ تھی۔ اور یہی بارش تیرے لیے بس اُبلتے ہوئے گٹر کا نظارہ لائی ہے۔ میں نے کہا بات تو سچ ہے۔ میں کیا سوچتا ہوں؟ میں کیا بولتا ہوں؟ میں کسے مانتا ہوں؟ اور‘ کیسے مانتا ہوں؟ بس ’’اندر‘‘ ایک گٹر ہے جو اُبلتا رہتا ہے۔ ارتیابیت، تشکیک، تعقل، تفلسف، سرتابی کی راہیں، فاسد تاویلیں، باطل توجیہیں، حیوانی خواہشیں‘ لذت پرستیاں، عافیت کوشیاں...... گٹر ہی تو ہے جو ابلتا رہتا ہے۔ تم اتنے سارے ’’بت‘‘ لے کر چلے آئے کعبے میں؟ پھر یوں دیکھتے ہو جیسے ابھی کالے پردے کا کونا سرکے گا اور کوئی ہاتھ ’’دوستی‘‘ کا تمہاری طرف بڑھے گا۔ شکل دیکھی ہے اپنی؟ ہاتھ دیکھے ہیں اپنے...... چھی! پھر ناک بھوں چڑھاتے ہو‘ یہاں کی نعمتوں پر، سہولتوں پر، مکہ والوں کے کہے سنے پر؟ ’’شرم تم کو مگر نہیں آتی‘‘...... بس یوں سمجھیے کہ گندگی سے اور دلدل سے باہر آنے کے لیے انسان جتنا بھی ہاتھ پاؤں مارے‘ اور ڈوبتا‘ اور لتھڑتا ہے۔ میں جتنا سوچتا...... اُتنا ہی اداس ہو جاتا۔ اداس نہیں...... مایوس اور بے زار! بے زار...... اپنے آپ سے، اس دنیا سے، یہاں کے واردات و مشاہدات سے، مقدّرات و امکانات سے، ماضی سے، حال سے، مستقبل سے، اس زندگی سے...... کہ ’’اب غمِ لاحاصلی سے بھی تو کچھ حاصل نہیں۔‘‘ اور...... ’’کرب اتنا تھا کہ مرجانے کو جی چاہتا تھا‘‘ لیکن فوراً سوچتا...... ’’مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟‘‘ مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ I was new to it. I Still feel my self at loss to descriebe it, rather to understand it. بس یوں سمجھیے......

از درِ ’’دوست‘‘ چہ گویم، بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بود و ہمہ حرماں رفتم

پھر یوں ہوا (...... پھر کیا ہوا؟) پھر یوں ہوا کہ تین آدمی اور ایک ’’کتا‘‘ مکہ سے مدینہ کو چلے۔ یہ ایک ٹیکسی کار تھی۔ صبح 9,8 بجے کا وقت تھا۔ یہ ایک عجیب سفر تھا۔ بیشتر وقت خاموش۔ خاموشی کبھی کبھی ٹوٹتی بھی رہی۔ ایک میاں بیوی اور بچہ، ایک مسافر اور‘ اور ایک ’’کتا‘‘...... یہ سب پاکستانی ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ پاکستانی ڈرائیور نے ان کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اب ان کی گفتگو کی کہانی کیا لکھی جائے۔ (نو واقف۔ گھڑی دو گھڑی کے ساتھی۔ محدود سی ’’باہمی دلچسپی‘‘ اور محدود سی ’’خیر

سگالی‘‘)۔ ہاں البتہ‘ اس خاموشی کی کہانی لکھی جانی چاہیے۔ کیا میں لکھ سکوں گا؟ یہ کہانی جو سچی ہے۔ جو آنکھوں دیکھی ہے۔ جو من بیتی ہے۔ سنیے......! صرف میرے لفظوں پر نہ جایئے گا کہ لفظ بسا اوقات ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، کم پڑ جاتے ہیں، تھک جاتے ہیں، عاجز ہو جاتے ہیں۔ لیکن کہانی تو تب بھی کہی جاتی ہے (بلکہ شاید تبھی کہی جاتی ہے)۔ بس آپ بھی کہانی سنیے گا۔ خاموشی کی کہانی۔ جب گاڑی ’’طریق الھجر ۃ‘‘ پر دوڑ رہی تھی۔ جب رمضان کی 27 تھی۔ جب دھوپ چمک دار بلکہ تیز تھی۔۔ تب یمین و یسار جدھر بھی نظر اُٹھتی تھی‘ دور تک بے آباد چٹیل زمینیں دکھائی دیتی تھیں......سنگلاخ......اور سنولائی ہوئی‘ پہاڑوں سے لدی ہوئی......ایک کے بعد ایک......یہ گھاٹی، وہ وادی، یہ پہاڑ، وہ چٹان، یہ میدان، وہ پہاڑ۔ ایک سناٹا، ایک ہو، ایک ہیبت۔ ایک خشک، خشمگیں اور مہیب چپ۔ خیال......عاجز اور درماندہ۔ نظر......پیاسی، ہانپتی ہوئی، نیم جان۔ اور......دل؟ ’’دل تھا گویا چراغ مفلس کا۔‘‘ پھر پتا نہیں کیسے، کس وقت......یکا یک دھوپ ٹھنڈی ہوگئی، منظر بولنے لگ گئے، اور پہاڑ......نہ خشک تھے، نہ خشمگیں۔ اللہ کی قسم۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ بس......اس سے آگے لفظ کم ہیں۔ لفظ نہیں ہیں۔ آنسو ہیں آنسو۔ (میں رو رہا ہوں......)......میری‘ اپنے تئیں یہ بھی بڑی ’’ہمت‘‘ ہے کہ یہاں تک لکھ پایا۔ اب اک توقف۔ مجھے ذرا سنبھلنے دیجیے۔ ہاں‘ ’’توقف‘‘ سے ایک البیلے اور نرالے دوست کی اکلوتی نظم کے چند مصرعے یاد آئے......

میرے ہمدم، میرے دَمساز/ تری عمر دراز/ میں نے پڑھ لیں تری آنکھیں‘ تری آنکھوں کے سوال/ تو بھی پڑھ لے میرا لہجہ، میرے لہجے کی تھکن/ میں نے کیوں صحبتِ ساحل سے کنارہ نہ کیا؟/ میرے ہمدم، میرے دَمساز‘ تری عمر دراز/ ہاں کوئی حرفِ تسلی، کوئی دلدار نظر/ اک ذرا ٹھہرو کہ آنکھوں کی چبھن بہہ نکلے/ اک توقف‘ کہ مرا دل میرے قابو میں نہیں!

ہاں......اک توقف کہ مرا دل میرے قابو میں نہیں!

دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ انہی آنکھوں سے، کھلی آنکھوں سے‘ (With these naked eyes)‘ بالکل سامنے کے منظر......مسافروں نے دیکھا کہ‘ کیا سے کیا ہوگئے۔ کوئی چبھن تھی نہ تیزی۔ کوئی جلال تھا نہ ہیبت۔ خنکی تھی۔ ایسی‘ کہ باقاعدہ محسوس ہوتی تھی اور اتنی‘ کہ دل میں اترتی چلی جارہی تھی۔ نرمی تھی۔ دل جوئی تھی۔ ملائمت تھی۔ کشش تھی۔ تسکین تھی۔ تسلی تھی۔ دلاسے تھے۔ سورج، ابر، ہوا......بلکہ ارض و سما......دنیا و مافیہا‘ اب کچھ اور تھے۔ اب سے پہلے کچھ اور تھے۔ طریق الھجر ۃ کے اس طرف کچھ اور‘ اُس طرف کچھ اور......

ابر، خورشید، قمر/ روشنی، پھول، صبا/ سب تھے موجود مگر/ ان کا مفہوم نہ تھا/ آپ نے ’’صل علیٰ‘‘/ سب کو مفہوم دیا۔/ آپ نے ’’صل علیٰ‘‘/ آپ نے ’’صل علیٰ‘‘/ آپ نے......(صلی اللہ علیہ وسلم)

کتنے چہچہے، کتنے زمزمے، کتنی گنگناہٹیں اور کتنے ارتعاشات تھے......انبوہ در انبوہ‘ جو یوں اُمڈے کہ سماعتیں سرشار ہوگئیں، دل جھوم جھوم اُٹھا اور دماغ تھا کہ کچھ جھینپ سا جاتا تھا‘ کچھ جھجک سا جاتا تھا۔ کچھ بے یقینی، کچھ یقین......بے یقینی سے بڑھا ہوا یقین۔ کچھ اندیشے، کچھ امیدیں......اندیشوں پر غالب آتی ہوئی امیدیں۔ سماعت سے آواز ٹکرائی......طلع البدر علینا۔ دماغ نے ٹوکا......نادان مت بنو۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا۔ دل نے کہا......نہ ہم جنید‘ نہ بایزید۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ (’’کُتّے‘‘ کی تو جیسے جان میں جان آچکی تھی۔ یوں کہیے......اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ سچ پوچھیں تو‘ اس کی تو

گویا ’’جُون‘‘ ہی بدل رہی تھی۔ What an amazing rather unbelieveable & surprising, metamorphosis it will be. ......وہ سوچنے لگا!) ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں رونے دو۔ ہمیں سسکنے دو۔ ہمیں بلکنے دو۔ ہمیں پھوٹ پھوٹ کر رونے دو۔ ہمیں ڈھائیں مارنے دو۔ ہم ابھی چپ ہو جائیں گے۔ مؤدّب ہو جائیں گے (ہمیں بس ذرا سی دیر ’’سُنّی‘‘ رہنے دو۔ پھر ہم ’’وہابی‘‘ ہو جائیں گے) سکوت سے بہرہ ور، سکینت سے بہرہ منداور طمانیت سے بہرہ یاب...... ہاں...... ہم سنبھل جائیں گے، ہم سنور جائیں گے۔ ہم سمجھ رہے ہیں، ہم سمجھ جائیں گے۔ کیا؟ یہی کہ طریق الھجر ۃ کے اُس پار‘ وہ جو بارگاہِ جلال و جبروت سجائے‘ جلوے کیا کرتا ہے‘ وہ ’’ربِّ محمدؐ‘‘ ہے۔ وہ سچے سوہنے سرورِ دلبر کا ربّ‘ ہمارا ربّ ہے (سب جہانوں کا ربّ ہے)۔ یہ سچے سوہنے کی مہربانی...... کہ ہم اندھوں کو روشنی دی‘ ہم مردوں کو زندگی دی‘ ہم ایسے پست، ذلیل، گھٹیا، حقیر، بے قیمت اور بے اوقات ’’دو پایوں‘‘ کو شرف، عزت اور توقیر دی۔ آدمیت اور انسانیت دی۔ ’’دی‘‘ نہیں...... لے کر دی۔‘‘ (دماغ نے پھر ٹوکا۔ دل نے صاد کیا) اُسی بارگاہ سے‘ یاں وہیں سے، وہیں سے، وہیں سے! یہ سوہنا سچا تھا جو ہمیں وہاں تک لے گیا۔ کتنی جان کھپائی‘ ساری عمر بتائی...... سچے سوہنے نے۔ بس اسی ایک کام میں! کیا کیا نہ بتلایا ‘کس کس طرح سے نہ سمجھایا...... ایسے جانا ہے، ایسے چلنا ہے، ایسے جھکنا ہے، ایسے ماتھا ٹیکنا ہے، ایسے بیٹھنا ہے، ایسے کھڑے رہنا ہے۔ یہ کہنا ہے۔ یہ نہیں کہنا۔ یہ مانگنا ہے۔ یہ نہیں مانگنا۔ یہ سوچنا ہے۔ یہ نہیں سوچنا۔ سمجھ میں آئے جب بھی، نہ سمجھ میں آئے جب بھی۔ ہم کیا ہماری ’’سمجھ‘‘ کیا؟ ہماری ’’سوجھتا‘‘ کیا؟ ہم عقل کے بیری‘ ایک دوسرے کے بیری (’کتا‘ کتے کا بیری)...... کھایا پیا، اینٹھ گئے۔ زیادہ کھا لیا تو اینڈنے لگے۔ کبھی اس سے بھڑے، کبھی اُس سے بھڑے۔ کچھ بھی نہ کھایا تو آہ و زاری، ذلت خواری۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ ایک مارا ماری۔ کسی کو ملا، کسی نہ ملا تو ایک چھینا چھپٹی۔ جگہ جگہ منہ ماری۔ جگہ جگہ بے زاری۔ کبھی اُس کو ڈرایا، کبھی اِس سے ڈرے، کبھی اُس کو دبایا، کبھی اس سے دبے...... سو بار جیے سو بار مرے۔ ’’مرنے‘‘ لگے تو دہائی دی، گڑگڑائے، اور لگے پکارنے...... پتھر کو، پہاڑ کو، پیڑ کو، پشو کو، پانی کو، آگ کو، ناگ کو، سورج کو، چاند کو، تاروں کو، اور اوتاروں کو! ’’جی اُٹھے‘‘ تو ہوئے جامے سے باہر۔ لگے پھنکارنے۔ گردن اکڑ گئی۔ اب باقی سب کی گردنیں ناپو۔ ناپو نہیں...... کاٹ دو، اتار دو، مار دو! کیسا جینا، کیسا مرنا؟ بس کبھی تماشا بننا، کبھی تماشا کرنا۔ اور کیا تھا آدمی؟ ایک تماشا...... بے ہودہ اور بے ہنگم! ایک دنیا...... بے شرف، بے راہ۔ ’’آدمی‘‘ کو ڈھونڈنے نکلو تو آدمی نہ ملے۔ ’’راستہ‘‘ ڈھونڈنے نکلو تو راستہ نہ ملے۔ (کز دام و دو ملولم وانسانم آرزوست)۔ تب ‘اک ’’عرب‘‘ نے آدمی کا بول بالا کر دیا۔ آدمی کا بول بالا‘ آدمی کا بول بالا...... کیسے؟ تاریخ کی گواہی تو آپ جانیں۔ آپ ایسے پڑھے لکھے، سوچنے والے، سمجھنے والے، چھاننے والے، پھٹکنے والے...... ہزار ہا سال کو چھاننے پھٹکنے والے...... جانیں‘ میں تو اتنا جانتا ہوں‘ نہیں...... کچھ جاننے لگا ہوں‘ کچھ جان پایا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آدمی کی تکریم کیا ہو گی کہ اُسے ’’محمدؐ‘‘ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منسوب کر دیا جائے۔ ہاں صاحب! یہاں...... محمد کے دیس میں...... ہر ناواقف‘ ہر انجان کو ’’محمدؐ‘‘ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کیا اپنائیت ہے، کیا اپنائیت ہے۔ سوچیے تو سہی۔ محسوس تو کیجیے۔ اب اور سنیے...... وہ کیا شعر ہے ’’جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی‘ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا‘‘۔ مسکین کا، محکوم کا، مجبور کا، ماتحت کا، مفلس اور کمزور کا، طیش کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ (قہرِ درویش بر جان درویش)۔ منافق کا طیش...... کس نے دیکھا ہے؟ وہ کینہ، بغض اور خبثِ باطن میں ڈھلتا اور ’’کندن‘‘ بن جاتا ہے۔ لیکن...... کھرے، بے باک، (Out

(Spoken, Bold & Blunt بے دھڑک اور گرم مزاج کا طیش کیا ہوا کرتا ہے؟ کیا ہوسکتا ہے۔ نہایت قابل فہم ہے۔ اب یہاں روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ کہیں نہ کہیں برہمی کے آثار ظاہر ہوئے۔ تیوری چڑھ گئی۔ تلخی، تیزی، گرمی بڑھنے لگی۔ لیکن...... اس دوران میں‘ ایک فریق کہتا ہے ’’صل علیٰ محمدؐ‘‘ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ واللہ باللہ...... یوں ہوتا ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا گیا ہو۔ (ارے کیا ’’وہابیؔ‘‘ ایسے ہوتے ہیں) بات یہ ہے کہ عربی وہابی اور عجمی وہابی میں اتنا ہی فرق ہے‘ جتنا خود عرب اور عجم میں...... یا‘ جتنا ’’تخمی‘‘ اور قلمی‘‘ میں۔ ویسے مجھے سب اچھے لگتے ہیں۔ واللہ۔ اور اگر آپ غور کریں تو پتا چلے گا کہ یہ سنی اور وہابی بھی...... دنیا کے ہر مذہب، ہر دھرم کے ماننے والوں میں ہوتے ہیں۔ یہ اصولی، فروعی کے پردے، پردے نہیں...... ’’چھلکے‘‘ تو ہم بعد میں چڑھاتے ہیں‘ آڑو پر نا شپاتی کا‘ خوبانی پر آلو بخارے کا۔ کتنے تکلّف سے؟ استاد نے سچ فرمایا...... ’’اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر‘‘)۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ آپ کسی دینی مسئلے پر (خصوصاً احکامی مسائل میں سے) اختلاف کا اظہار کرتے ہیں‘ سننے والا فوراً حدیث شریف سے دلیل لائے گا۔ اب اگر آپ نے بھی حدیث ہی کا حوالہ دیا تو خاموش ہو جائے گا۔ کوئی ناگواری، کوئی شکست خوردگی کی کیفیت دور دور تک نہیں۔ یہ جو اپنے یہاں ہر وقت مناظرے کی خواہش (بلکہ خارش) لوگوں کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ یہاں اس کا نام ونشان نہیں۔ تم حنفی ہو؟ تمہاری تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ تم شافعی ہو؟ ارے کہاں پھنس گئے؟ خالص دین تو ادھر ہے۔ یہ رہا۔ ابھی شلوار کی جیب سے نکال کر دکھاتا ہوں۔ یہ بدتمیزی، یہ بدمذاقی یہاں نہیں ہے۔ نئی نسل البتہ اس سے ملتے جلتے کچھ مسائل میں مبتلا ہو رہی ہے۔ اس کے اسباب بھی خارجی ہیں۔ ’’خارجی‘‘ سے مراد یہ ہے کہ ہم آپ ایسے مہربانوں کی ’’محنت‘‘ سے ’’بالآخر‘‘ کچھ ذوق ’’نان ایشوز‘‘ کو ایشوز بنانے کا بہر حال پنپ گیا ہے۔ لیکن ایک اہم ترین سبب اس ’’تاناری ری‘‘ کے نہ ہونے کا‘ یہ ہے کہ حکومت خود یکسو ہے۔ بات کسی اور طرف نکل گئی۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بہت دفعہ کسی امام کو‘ کسی خطیب کو (اور خصوصاً...... حلقۂ تحفیظ کے کسی بچے کو) قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو احساس ہوتا ہے کہ آپ کوئی ’’زندہ کلام‘‘ سن رہے ہیں۔ یہاں مجہول پڑھنے والے بھی ہیں۔ بے رغبتی، بے لذتی سے پڑھنے والے بھی ہیں لیکن...... بہت سے ایسے بھی ہیں جو بے ساختہ پڑھتے ہیں یوں...... کہ معانی کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں، اور ساتھ ہی دل کے دروازے اور دماغ کے دریچے بھی۔ یہ بھی ایک اور ہی قصہ ہے۔ تفصیل چاہتا ہے۔

حواشی

(1) حافظ محمد ارشاد‘ پیشے کے اعتبار سے مکینیکل انجینئر ہیں۔

(2) الامام ابو معاویہ ابوذر الحسنی البخاری رحمتہ اللہ علیہ (1345ھ...... 1416ھ)

☆☆☆